حرف وسخن
HARF-O-SUKHAN
Urdu Research Journal of PAKISTAN
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.1 2024

اقبال اور ترقی پسند تحریک ایک جائزہ

لیاقت علی،

پی ایچ ڈی اسکالر، جی سی یونیورسٹی لاہور

ڈاکٹر شائستہ حمید

ایسوسی ایٹ پروفیسر، جی سی یونیورسٹی لاہور

ABSTRACT:

The life and works of Allama Muhammad Iqbal has been a topic of great debate among laureates, critics, scholars and readers as well. He had spent a life more than a poet. His life and his poetry and prose has been pen down, admired and criticized by numerous authors, writers and scholars though the dimensions of his life and works seem endless. Therefore critics have a infinite ground to study his philosophical, religious, social, economical, mystical, cultural, political and metaphysical thoughts. The present article is about progressive movement and its connection with Iqbal. Iqbal gave number of clues in his poetry and prose about social and economical progress of the Muslims of India and also for the deprived classes of the society. In this way question arises in the mind that what motivated Iqbal to write on the laborers and workers? Was he really a progressive poet of his time? Why Iqbal did not stay alongside with the progressive writers of his age? The article also narrates the advent of the progressive movement and relates it with Allama Iqbal.

کلیدی الفاظ: ترقی پسند تحریک، اشتراکیت، ملوکیت، فلسفہ اقبال، مارکسزم، وطن پرستی

ترقی پسند تحریک جس کا باقاعدہ آغاز 1936 میں منشی پریم چند (1880-1936) کے خطبہ صدارت سے ہوا، بنیادی طور پر ایک باغیانہ تحریک تھی، لیکن یہ بغاوت ذہنی رویوں اور فکری جہتوں میں جتنی نمایاں تھی، اتنی ادب میں نہیں تھی۔ "انگارے" کی کہانیوں سے قطع نظر وہ ایک تجرباتی دھماکہ تھا۔ شعر و ادب میں اس تحریک کے نمائندہ فن کاروں نے ادبی روایت سے رشتہ قائم رکھا۔ ادبی تاریخ کے غالب رجحانات پر نظر رکھی اور تخلیقی میدان میں نئے تجربات کی ترغیب کو حد اعتدال میں رکھنے کی کوشش کی۔ اس خیال کو بھی رد کرنا مشکل ہے کہ ادب میں ترقی پسندی کا رجحان، جس نے بعد میں تحریک کی شکل اختیار کر لی تھی, اس جدید رجحان اور عمل کا ایک حصہ تھا جس کا آغاز محمد حسین آزاد (1830-1910)، مولانا الطاف حسین حالی (1837-1914) اور سرسید احمد خان (1817-1898) کے عہد میں ہوا۔ انیسویں صدی کی آخری چار دہائیوں میں نثر و نظم، نئی اصناف، اور نئے اسالیب ہی نہیں، نئے موضوعات بھی متعارف ہوئے۔ اس لیے کہ نوآبادیاتی طرزِ حیات میں معاشرتی اور تعلیمی سطح پر جو تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں ان کے زیرِ اثر نئے زاویہ ہائے نظر پیدا ہو رہے تھے۔ اس زمانہ کے اہل نظر اور اہل قلم کے فکر و احساس میں انفرادیت کی جگہ اجتماعیت داخل ہو رہی تھی، دلوں میں ملک و قوم کی محکومی اور خستہ حالی کا درد جگہ بنا رہا تھا۔ وہ اپنے عہد کی تبدیلیوں کو ایک اجتماعی اور تنقیدی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ ایک طرف اجنبی قوم کی ذلت آمیز محکومی کا احساس تھا تو دوسری طرف مغلیہ عہد کی مطلق العنانی اور عہد وسطی کے بوسیدہ جاگیر دارانہ نظام سے نجات کی تسکین بھی تھی۔ لیکن اس سے زیادہ اہم نئے نظام میں قانون کی حکمرانی اور جمہوری جھلکیاں ایک ایسے فلاحی سماج کی تصویر دکھا رہی تھیں جس میں انسان نسبتاً زیادہ وقار اور آزادی سے جی سکتا تھا، امید و بیم کی کشمکش اس عہد کی نظم و نثر میں جدید اسالیب کو پروان چڑھا رہی تھی۔ سرسید کی علی گڑھ تحریک بلاشبہ اس کا سرچشمہ تھی لیکن ادب میں اس تحریک کی بنیاد جن تصورات پر تھی، وہ تھے تعقل دوستی اور فطرت پرستی، ماضی کی فرسودہ

اور لایعنی رسوم وروایات سے بے زاری، اصلاحی لائحہ عمل وطن دوستی کے جذبات اور تعلیم و تہذیب کی ایک نئی بساط کا خیر مقدم، ان سب کے پیچھے عقلی زاویہ، فکر کی روشنی میں کلیدی کردار ادا کرتی نظر آتی ہے۔ مولانا حالی کی "مقدمہ شعر وشاعری" نے نئی شاعری اور جدید ادب کی بوطیقا کا درجہ حاصل کر لیا تھا جس میں تخلیقی عمل کو سماجی سرگرمیوں سے جوڑ کر متحرک اور معنی آفرینی کی شکل دی گئی تھی"[1]

ادب میں اجتماعی بیداری اور نشاۃ ثانیہ کے برگ وبار بیسویں صدی کے ابتدائی دہوں میں زیادہ شیریں اور متنوع ہو جاتے ہیں۔ قلم کاروں کی سرکشی کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔ حاکم طبقوں کے خلاف آہستہ آہستہ مفاہمت کی بجائے مزاحمت کا رویہ پروان چڑھنے لگتا ہے اب صرف جاگیر دارانہ عہد کے رسم ورواج اور قدامت پرستانہ رویے ہی نشانہ ملامت نہیں ہوتے بلکہ ایک نیا متوسط طبقہ ذہنی بے داری اور روشن خیالی کی ایک نئی جہت سامنے رکھتا ہے۔ اس عہد میں دو دھارے صاف نظر آتے ہیں۔ ایک طرف حقیقت پسندی، تعقل پرستی اور واقعیت نگاری کا رجحان رکھتا جو ملک کی سیاسی بیداری، قوم پرستانہ جوشیلے خیالات اور اصلاحی عمل سے جڑا ہوا تھا، دوسرا رجحان رومانوی فکر واحساس کی نمائندگی کرتا تھا، جو سرسید تحریک کی اصلاحی اور اخلاقی متانت کے خلاف ایک طرح کا رد عمل اور کلاسیکی روایت کی فرسودگی کے ورثہ سبک دوشی کی خواہش کا اشاریہ تھا۔

اس عہد میں سجاد حیدر یلدرم (1880۔1943)، نیاز فتح پوری (1884۔1966)، قاضی عبد االغفار(1889۔1956) اور مجنوں گور کھپوری (1904۔1988) جیسے قد آور ادیب تھے جن کی تخلیقات کو حقیقت نگاری کے مقابلے میں رومانوی رجحان سے منسوب کر دیا گیا۔ نیاز فتح پوری کے افسانوں میں باغیانہ رویے کے ساتھ ساتھ حسن اور مسرت کے سر چشموں کی کی تلاش ہے سجاد حیدر یلدرم اور مجنوں گور کھپوری کے افسانوں میں حقیقت پسندانہ شعور میں حسن خیر اور روحانیت کا امتزاج ملتا ہے۔ پروفیسر فتح محمد ملک کے تنقیدی شعور نے انہیں اس عمل کا حصہ تسلیم کیا۔ انہوں نے ادبی فن پارے کے جمالیاتی پہلو ہی کو موضوع نہیں بنایا بلکہ یہ جاننے کی بھی سعی کی ہے کہ غالب(1797۔1869) سرسید اور اقبال(1877۔1938) کے بعد جنم لینے والا ادب، اپنے عہد کے شعور سے کس حد تک بہرہ مند ہے۔

اسی باب میں وہ ہماری روایت سے جو کچھ دریافت کر کے لائے، وہ حیرت انگیز ہے۔ ن م راشد(1910۔1975) سعادت حسن منٹو(1912۔1955) اور فیض احمد فیض(1911۔1984) کے تخلیقی کام پر فتح محمد ملک کی تحقیق اور تنقید معرکہ آرا ہے۔ یہ ان کی ادبی شخصیات کی بازیافت ہے۔ فتح محمد ملک کے تخلیقی کام سے معلوم ہوتا ہے کہ 'بے چارے' کے ہاں ان شخصیات کی درست تفہیم نہیں ہوئی۔ اسی نظری تسلسل میں، اب انہوں نے اس فکری معرکہ کی بھی تفہیم نو کی ہے جو انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام سے برپا ہوئی اور اس نے ہمارے نظریاتی افق کا احاطہ کر لیا۔ اقبال کے ہاں یہ رویہ بعد میں فلسفیانہ فکر کی طرف مڑ گیا۔

> In 1936 Iqbal published the last book of his life, *Zarb-e-Kaleem* (The Rod of Moses). In the words of Iqbal this book is "A Call to War against the Present Times". These poems are direct...... as direct as the Quranic Verse: "*L'anatullah e , alal Kaazzibin*" (God curse upon liars), and will disappoint lovers of oblique poetry. They have been inspired by outside events like Picasso's *Guernica*. What sustains the political, topical and social themes of these poems in their rhythm, cadence and rhetoric. They were written during the most Stormy period of India's freedom struggle, and what is reflected in every line of this book. Iqbal throughout his creative life condemned the theory of Art and Arts sake. He believed in Art of life. He wanted poetry to share the responsibility of religion and philosophy to understand the relationship of man and the universe. And man as a conscious creator. The section on Art in this book contains a poem which is like a behest of a great poet to the coming and the younger generation of poets.[2]

مغرب کی رومانوی شاعری کے برعکس ان شعراء کے کلام میں نو آبادیاتی غلامی سے نجات اور سماج کو بدلنے کا جذبہ بھی بار بار ابھر کر سامنے آتا ہے اور اس طرح یہ شاعری ماورائی تخیل کی رنگ آمیزی کے باوجود اس عہد کی زمینی حقیقتوں سے زیادہ دور نہیں جاتی، یہی نہیں علامہ اقبال اور جوش ملیح آبادی(1898۔1848) کے کلام میں 1917 کے روسی انقلاب کی گونج بھی صاف سنائی دیتی ہے۔ مہاتما گاندھی (1869۔1948) مولانا ابولکلام آزاد(1958-1888) اور جواہر لعل نہرو

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.1 2024

(1889۔1964) کی قیادت میں آگے بڑھنے والی، جدو جہد آزادی کے مختلف مراحل کے نقوش بھی ان بیدار ذہن شعراء کے کلام میں نہیں ہے۔ ملک میں فروغ پانے والی ، محنت کش عوام کی دوسری تحریکوں اور بیداری جمہور کی عالمگیر حقیقتوں کے احساس وادراک سے بھی ان شعراء کا کلام خالی نہیں ہے۔

ترقی پسند تحریک اردو کی ایک مؤثر تحریک تھی اور کوئی بھی اس سے صرف نظر نہیں کر سکتا تھا۔ پروفیسر صاحب علی نے اپنی کتاب میں اس تحریک کی بمبئی میں سرگرمیوں کو بہت احسن انداز سے اہم حضرات کے مضامین کی صورت میں شامل کیا۔ جس سے اس تحریک پر روشنی پڑتی ہے۔ 1932 میں چند نوجوان لکھنے والوں نے اپنی کہانیوں کا ایک مجموعہ لکھنؤ سے "انگارے" کے نام سے شائع کیا۔ ان لکھنے والوں میں سید سجاد ظہیر (1899۔1973)، احمد علی (1910۔1994)، ڈاکٹر رشید جہاں (1905۔1952)، اور محمود الظفر شامل تھے۔ سید سجاد ظہیر کی کوششوں سے ترقی پسند ادیبوں کی پہلی کانفرنس اپریل 1936 میں ہوئی اور منشی پریم چند نے اس کی صدارت کی۔ انہوں نے اپنے خطبہ صدارت میں کہا: "ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم میں حرکت اور بے چینی پیدا کرے، سلائے نہیں۔ کیوں کہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہے۔"[3]

شاہد احمد دہلوی (1906۔1967) نے 1935 میں دہلی سے ترقی پسند تحریک کا آغاز کیا اور اس کے اولین سیکرٹری کے طور پر فرائض سر انجام دئے۔ ان کے رسالہ "ساقی " میں ماہانہ وار انجمن کی روداد شائع ہونے لگی۔ شاہد احمد دہلوی نے میکسم گورکی (1868۔1936) کے دن کی مناسبت سے انجمن میں ایک مضمون پیش کیا" میکسم گورکی ہمارے لیے ایک مثالی نمونہ " جس کے ابتدائی جملے ہی مسلمان مصنفین پر بجلی کی طرح گرے۔ مزید کہا " اپنے مقاصد کے حصول کے لیے روسی مصنفین شمع ہدایت کا کام دے سکتے ہیں"[4] اسی اجلاس میں گورکی کی یاد میں حاضرین دس سیکنڈ کے لیے کھڑے رہے۔ جب جون 1938 میں انجمن کے تعزیتی اجلاس کی روداد "ساقی " میں شائع ہوئی تو اس کے مطابق، اقبال کے انتقال پر فاتحہ خوانی کی بجائے حاضرین ایک منٹ تک خاموش کھڑے رہے۔[5] علاوہ ازیں 1936 میں "ساقی " کے اداریے میں یہ تحریر کیا۔ "ساقی میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ہمارا ادب زندگی کا آئینہ دار ہو۔ ہمیں ایسی شاعری اور ادب کی ضرورت ہے۔ جو ہمیں آمادہ پیکار کر دے۔[6]

ترقی پسند تحریک کے تمام شعراء نے کچھ ایسی نظمیں، کچھ ایسے شعر اردو ادب کو دیے ہیں جو اردو کا شاہکار ہیں۔ فیض کی "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے"، "تنہائی"، "زندگی کی ایک صبح، اسرار الحق مجاز کی "آوارہ اور خواب سحر"، ساحر کی "تاج محل، اور پرچھائیاں، جعفر کی میرا سفر اور پتھر کی دیواریں، جاں نثار اختر کی خاک دل اور آخری ملاقات اور مجروح سلطانپوری (1919۔2000) کے ان گنت اشعار جو ضرب الامثل بن چکے ہیں۔ ان تمام شعراء کی شاعری انسان سے محبت اور مستقبل پر یقین کی شاعری ہے۔

جاں نثار اختر:

جینے کی ہر طرح سے تمنا حسین ہے
دریا کی تند باڑھ بھیانک سہی مگر
ہر شئے کے باوجود یہ دنیا حسین ہے
صحرا کا ہر سکوت ڈراتا ہے تو کیا
جنگل کو کاٹتا ہوا رستہ حسین ہے

اردو ادب میں ترقی پسند تحریک سے قبل ایک لہر رومان پسندی کی آئی۔ جس کے سب سے بڑے نمائندہ مجنوں گورکھپوری تھے۔ مغربی ادب اور مغربی افسانے کے گہرے مطالعہ کی وجہ سے اس دور میں مجنوں گورکھپوری نے جو افسانے لکھے ان میں تیکھا پن تھا۔ تکنیک بھی نئی تھی۔ افسانہ کلائمکس سے شروع ہوتا اور بتدریج المیہ پر انجام ہوتا۔ ان کے افسانے ہندوستان کے ان گھرانوں کی تصویر کشی کرتے تھے جہاں لڑکے لڑکیاں محبت تو کرتے تھے لیکن معاشرتی جکڑ بندیوں کی وجہ سے اندر ہی اندر گھٹ کر دق کے

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.1 2024

مرض میں مبتلا ہو کر خون تھوکتے دنیا سے اپنے تشنہ خواب اور ناکام محبت کی حسرت لیے چلے جاتے تھے۔ مجنوں نے گرد و پیش کا جو مشاہدہ کیا تو انہوں نے اپنے افسانوں میں عورت اور مرد کو سماجی جکڑبندیوں سے آزاد دکھایا۔ان کے افسانوں کا مرکزی موضوع محبت اور محبت کے ساتھ دکھ،اذیت اور گھٹن کے جذبات واحساسات کا عکاس رہا۔ان کے ہاں ایک ناسٹلجیا کی کیفیت بھی ملتی ہے اور محبت کرنے والے زخمی دلوں پر جو قیامت گزرتی ہے، حزن و بے بسی کی کیفیات اور انجام کار جو انہوں نے دیہات کے درمیانے طبقے کی زندگی، ان کی طرز و بود باش اور رہن سہن کو اپنے افسانوں میں بیک وقت رومان، نفسیات اور فلسفے کی آمیزش ملتی ہے مجنوں کو محبت کے افسانے لکھنے میں بھی مشاقی حاصل تھی ان کے افسانوں کو پڑھ کر دل پر چوٹ پڑتی تھی اور جی چاہتا تھا کہ اے کاش! ہمیں بھی کسی سے عشق ہو جائے۔ان کے افسانوں کی تاثیر کے حوالے سے یہ واقعہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ افسانہ " سمن پوش "پڑھ کر بریلی کے شفقت نامی نوجوان نے خودکشی کر لی تھی۔ مغرب میں یہ اعزاز گوئٹے کے اکلوتے ناول "نوجوان ورتھر کی داستانِ غم "کو حاصل ہے۔ جسے پڑھ کر خودکشی کے ایسے واقعات یورپ میں رونما ہوئے تھے۔ آگے چل کر انہوں نے انسانی تمدن اور اس کے تمام شعبے کا بنیادی پتھر اقتصادیات کو قرار دیا اور سب کو زندگی اور تہذیب کے یکساں مواقع میسر آنے پر زور دیا۔ سجاد ظہیر ترقی پسند تحریک کے بانیان میں شمار ہوتے ہیں۔انہوں نے ترقی پسند تحریک کو نظریاتی اساس مہیا کی اور پھر عمدہ وکالت سے اس تحریک کی سب سے نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ تنقید کے موضوع پر انہوں نے کوئی باقاعدہ کتاب تو نہیں لکھی لیکن ان کی کتاب "روشنائی"ترقی پسند تحریک کی تاریخ بھی ہے اور تنقید بھی ۔ سجاد ظہیر اردو کے پہلے نقاد ہیں جن کے مضامین مارکسی تنقید کے آئینہ دار ہیں۔ سجاد ظہیر نے صرف چند مضامین لکھے ہیں۔ عبادت بریلوی(1920۔1998)لکھتے ہیں: "ان مضامین میں ایسی گہرائی ہے جس نے تنقیدی اعتبار سے ان کو(سجاد ظہیر)نہایت اہم بنا دیا"[7] سجاد ظہیر،اقبال کے ہم عصر ہیں۔ندیم شفیق ملک اپنی کتاب "اقبال کی رخشندہ یادیں" میں دونوں کی ملاقات کا احوال روشنائی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "پنجاب کے اس سفر میں مجھے علامہ اقبال سے ملنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ پہلی بار جب میں لاہور آیا تھا تو ڈاکٹر صاحب سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ ظاہر ہے اقبال سے ملنا اور ترقی پسند ادب کی تحریک کے متعلق ان سے گفت گو کرنا ہمارے لیے ضروری تھا۔ محمد دین تاثیر(1902۔1950) نے امرتسر میں کہ انہوں نے علامہ اقبال سے نئی تحریک کے بارے میں گفتگو کی ہے اور انہوں نے اس سے ہمدردی اور دل چسپی کا اظہار کیا ہے۔" [8]

ہمارے ساتھ علامہ اقبال کے التفات وعنایات کا انداز ہی کچھ ایسا تھا کہ مجھے جرات ہوئی کہ سب سے پہلے ان سے ہمیں جو اختلافات اور شکایات ہیں وہی ان کے سامنے پیش کروں اور محض عقیدت مندی کی باتیں نہ ہوں۔ سوشلزم کے بارے میں گفتگو شروع ہو گئی اور شاید میں نے ان سے کہا کہ ہماری نظر میں قوم کی غلامی، بین الاقوامی جنگ، محنت کشوں کے ظالمانہ استحصال کا علاج موجودہ دور میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ لیکن انہوں نے بعض مقامات پر اپنے کلام میں اشتراکی نظریہ پر غلط نقطہ چینی کی ہے۔خود ان کی آزادی خواہی اور انسان نوازی کی منطق ہمیں سوشلزم کی طرف لے جاتی ہے اور ہماری نظر میں نوع انسانی کی موجودہ ارتقاء کی منزل وہی ہے میں نے کہا: نوجوان ترقی پسند ادیبوں کا گروہ اس نئے نظریے سے کافی متاثر ہے۔ وہ بڑی توجہ اور سنجیدگی سے میری باتیں سنتے رہے بلکہ مجھے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس طرح کی باتوں کے لیے میری ہمت افزائی فرما رہے ہیں۔

> "تاثیر نے مجھ سے ترقی پسند تحریک کے متعلق دو ایک باتیں کی تھیں اور مجھے اس سے بڑی دل چسپی ہوئی ہے۔۔۔ ممکن ہے سوشلزم کے سمجھنے میں مجھ سے غلطی ہوئی ہو۔۔۔۔ بات یہ ہے کہ میں نے اس کے متعلق کافی پڑھا نہیں ہے۔ میں نے تاثیر سے کہا تھا کہ وہ اس موضوع پر مجھے کتابیں دیں۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا لیکن ابھی تک پورا نہیں کیا۔ میرا نقطہ نظر آپ جانتے ہیں۔ ظاہر ہے مجھے ترقی پسند ادب یا سوشلزم کی تحریک کے ساتھ ہمدردی ہے آپ لوگ مجھ سے ملتے رہیے"۔ [9]

حرف و سخن
HARF-O-SUKHAN
Urdu Research Journal of PAKISTAN
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.1 2024

ڈاکٹر سلیم اختر بھی علامہ اقبال سے سجاد ظہیر کی ملاقات کا حال روشنائی کے حوالے سے لکھتے ہیں: "میرا نقطہ نظر آپ جانتے ہیں ظاہر ہے کہ مجھے ترقی پسند ادب اور سوشلزم تحریک سے ہمدردی ہے آپ لوگ مجھ سے ملتے رہیے"۔ [10]

انیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی کا دور ہندوستان کی سیاسی بیداری کا دور تھا۔اس دور نے مختلف تحریکوں کے ادیبوں کو متاثر کیا۔ مختلف دانشوروں نے اپنے خیالات کا اظہار کھل کر کیا۔ایسے میں اقبال کے ہاں جو ترقی پسندی ہے اس کا نکتہ آغاز بھی یہی ہے۔ سرسید احمد اور حالی کی اصلاحی تحریک کے بعد اقبال کے افکار خالصتاً ترقی پسند تھے ۔ صنعتی انقلاب نے معاشرے میں جو راہ روی، بھوک، افلاس غربت پیدا کی ہے۔اس سے جس قدر اثرات اقبال نے قبول کیے، ویسے کسی اور کے ہاں نہیں ملتے۔اس دور کے سبھی ادباء نے اس تحریک کا اثر قبول کیا تھا۔ مولانا ظفر علی(1873۔1956)، خاں، اختر شیرانی(1905۔1948)، کے خیالات بھی ترقی پسندانہ دکھائی دیتے ہیں۔اس دور کے ادیب اور شاعر جو کہ پہلے سے سرسید اور حالی کی تحریک سے متاثر تھے بعد میں انھوں نے بہت جلد ترقی پسند تحریک کو ذہنی طور پر قبول کر لیا۔ جن میں احمد ندیم قاسمی (1916۔2006) کا نام بھی شامل ہے۔ جو اقبال سے کس قدر اثر قبول کرتے ہیں۔ علی سردار جعفری(1913۔2000) لکھتے ہیں: "یہ تمام چیزیں ترقی پسند ادب کے ساتھ کچھ اس طرح مل گئیں کہ ہر نیا ادب ترقی پسند قرار دیا گیا، اور ہر نئی تحریر ترقی پسند ادب کا نمونہ بنا۔ادب اور ترقی پسند ادب ہم معنی الفاظ ہو گئے" [11]

اقبال برصغیر میں ترقی پسند مصنفین کا پیش رو تھا۔ وہ مغربی سامراج کی فتنہ سامانیوں اور سرمایہ دارانہ نظام کی سنگ دلانا لوٹ کھسوٹ اور اس کے نتیجے میں جنم لینے والی برائیوں کے خلاف ہمیشہ مسلسل آواز اٹھاتا رہا۔ کیوں کہ ان کے نزدیک مشرق و مغرب کی قوموں کی نجات مغربی سامراج کی شکست میں تھی اور سرمایہ دارانہ نظام کے مکمل خاتمے کے طور پر تھی۔ برصغیر میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد 1935 میں رکھی گئی جب کہ اقبال 1904 میں علم الاقتصاد جیسی شاہکار کتاب کے علاوہ 1922 تک سلطنت، خضر راہ، فرمان خدا(فرشتوں سے)، صحبت رفتگاں، محاورہ مابین حکیم فرانسوی آگسٹس کومٹ و مرد و مزدور، مسولینی اور قیصر ولیم، قسمت نامہ سرمایہ دار و مزدور اور نوائے مزدور جیسی نظمیں لکھ چکا تھا۔اقبال کی مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق " 1935 تک مکمل ہو چکی تھی بعد میں 1936 میں شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔اقبال کی اس مثنوی کو سرمایہ داری نظام کے متعلق حتمی تجزیہ کہا جا سکتا ہے۔جب اس نے کہا:

تا تہ و بالا نہ گردد ایں نظام

دانش و تہذیب دیں سودائے خام

علم الاقتصاد اردو زبان میں جدید معاشیات پر پہلی کتاب ہے اس کے بعد اس موضوع پر کتابیں شائع ہوئیں اور مضامین لکھے گئے ۔ گزشتہ دور میں شاہ ولی اللہ (1703۔1762) دہلوی جیسے مفکر نے انسانی تہذیب و تمدن اور اس کے عروج و زوال کے مطالعہ کے سلسلے میں معاشی اور اقتصادی عوامل کا جائزہ لیا۔ سرسید احمد خاں کے ہاں اسباب بغاوت ہند کی کشمکش کے معاشی پہلوؤں پر تبصرہ کیا۔ شریف کنجاہی نے علم الاقتصاد کے پنجابی ترجمہ کے پیش لفظ میں لکھا ہے: "علم الاقتصاد وچ اوہناں ناں مارکس داناں لیا اے، نہ سوشلزم دا۔ایسے طرح اس کتاب وچ انگریزی راج بارے وی اوہ نفرت نہیں ملدی جہڑی بعد وچ سانوں دسدی اے"۔ [12] یہ موضوع اقبال کی زندگی میں کس قدر اہم ہے انھی کی زبان سے سنتے ہیں:

"ذرا خیال کرو کہ غریبی یا یوں کہو کہ ضروریات زندگی کے کامل طور پر پورا نہ ہونے سے انسانی طرز عمل کہاں تک متاثر ہوتا ہے۔ غریبی قوی انسانی پر برا اثر ڈالتی ہے، بلکہ بسا اوقات انسانی روح کے مجلہ آئینہ کو اس قدر زنگ آلود کر دیتی ہے کہ اخلاق اور تمدنی لحاظ سے اسکا وجود عدم برابر رہ جاتا ہے۔" [13]

اقبال نے اپنے تعلیمی سفر یورپ کے دوران مغربی سرمایہ داری نظام کا خوب مطالعہ کیا جس میں یورپ ایک فکری انتشار میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے اور اس عہد کے ادب میں کئی مرگ آفریں رجحانات ابھر کر سامنے آ چکے تھے لیکن اقبال نے ان تمام رجعت پسند ادبی تحریکوں کے برعکس حقیقت پسندی کو اپنا موضوع بنایا۔ ترقی پسند ادب کی نمایاں خصوصیات میں سرمایہ داری نظام، معاشی اور سیاسی مسائل، طبقاتی شعور اور سماجی انقلاب شامل ہیں۔ اقبال کی شاعری میں یہ تمام عناصر غالب نظر آتے ہیں جس سے آپ نے عوام کو انقلاب و رجائیت، عزم و ہمت اور حرکت و تغیر کا پیغام دیا:

عالم نو ہو رہا ہے پیدا، وہ عالم پیر مر رہا ہے

جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ (بال جبریل)

اقبال کے نزدیک وہ شاعری قابل قدر ہے جو قدیم روایات، تقلید اور عالم کہنہ کو تہ و بالا کر دے اور ذہنوں میں انقلاب برپا کر دے۔ انہوں نے بڑی بے باکی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے:

صنم کہ توبہ نہ کرد ز فاش گوئی ہا

نہ بیم ایں کہ بسلطان کنند غمازی (ارمغان حجاز)

(میں نے کھری کھری باتیں کہنے سے توبہ نہ کی اور نہ ہی مجھے یہ ڈر رہا کہ کوئی شخص حکمران طبقہ کے پاس میری شکایت یا مخبری کرے گا)

اقبال کائنات، زندگی اور سماج میں تغیر و حرکت کا قائل ہے۔ ان کے نزدیک زندگی کا معاشی پہلو نہایت اہم اور ناگزیر ہے۔ بقول اقبال "میری غرض شاعری سے زبان دانی کا اظہار یا مضمون آفرینی نہیں، نہ میں نے آج تک اپنے آپ کو شاعر سمجھا۔ میرا مقصد گاہ گاہ لکھنے سے صرف اس قدر ہے کہ چند مطالب جو میرے ذہن میں ہیں ان کو مسلمانوں تک پہنچا دوں۔ زبان اردو یا فن شاعری سے مجھے کوئی سروکار نہیں، میرے مقاصد شاعرانہ نہیں، بلکہ مذہبی اور اخلاقی ہیں۔" 14

اس کے برعکس ترقی پسند ادیبوں کی مقصدیت میں انسان اور انسانیت کا کلٹ (cult) بنا دیا گیا ہے اور اس کی اساس اور اقتصادیات، عمرانیات اور طبقاتی جدوجہد پر استوار تھی۔ اس تحریک نے مذہب سے مملو مابعد الطبیعات کو بھی مسترد کر دیا شاید اس لیے اس نے عوام کو خوف زدہ کر دیا اور یہ متنازعہ ثابت ہوئی۔

اقبال زندگی کے معاشی پہلو سے پوری طرح آگاہ تھے اس حقیقت کا ثبوت ان کے کلام میں اچھی طرح دیکھا جا سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے معاشی استحصال کی سنگ دلی کو محسوس کیا اور اس کے خلاف آواز اٹھائی۔ اس حوالے سے سب سے بڑی حقیقت یہ سامنے آتی ہے۔ اقبال کی سب سے پہلی تصنیف "*علم الاقتصاد*" تھی، جو 1904 میں شائع ہوئی، اردو زبان میں جدید معاشیات پر یہ پہلی تصنیف ہے جس میں اہم معاشی مسائل کو بڑی صراحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ علامہ اقبال بنیادی طور پر ادب برائے مقصد کے حامی تھے ان کا تمام کلام اس بات کا شاہد ہے۔ ادب برائے ادب کے الفاظ ناپسند ہوں تو ادب برائے قومی یا ادب برائے اسلام کہہ لیجیے۔ لیکن بنیادی بات یہ ہے کہ وہ ادب میں بے معنویت کے قائل نہ تھے۔ اس لیے ترقی پسند ادب کی تحریک کے نوجوان اور جوشیلے مصنفین سے ہمدردی رکھتے تھے اور ان کے مقاصد سے دل چسپی کا اظہار بھی کیا۔

ترقی پسندی اقبال کے افکار (شاعری، خطوط، خطبات) کا غالب موضوع ہے۔ جسے بعض ترقی پسندوں کے نزدیک تنقید کا نشانہ بھی بنایا گیا۔ اس مقصد کے لیے افکار اقبال کا جزوی کی بجائے کلی طور پر جائزہ لینا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ اقبال کے مختلف ادوار اور حالات حاضرہ کا جائزہ بھی اہم ہے اور ترقی پسندوں سے اقبال کے مراسم جاننا بھی بہت ضروری ہے۔ سوشلزم یا اشتراکیت اقبال کی شاعری کا ضمنی موضوع ہے۔ اقبال کی شاعری کے ادوار کا جائزہ، حالات کے پس منظر میں لینا، سوشلزم اور اشتراکیت کے سیاق و

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.1 2024

سباق کے ساتھ غائر مطالعہ کرنا۔اقبال نے ڈرامائی انداز میں اپنی شاعری سے بڑا کام لیا ہے اور مختلف کرداروں کے ذریعے بعض مسائل حیات پیش کیے ہیں یا بعض تحریکوں اور رجحانات پر تبصرہ کیا ہے ضروری نہیں کہ یہ خیالات اقبال کے اپنے ہی ہوں یا انہیں کلی یا جزوی طور پر ان سے اتفاق ہو۔ چنانچہ اشتراکیت کے بارے میں اقبال کے شعری تبصرے زیادہ تر مختلف کرداروں کے مکالموں ہی کی صورت میں عصری واقعات و حوادث پر خضرؑ کی زبانی تبصرہ کرتے ہوئے انقلاب کا تحسین آمیز تجزیہ پیش کیا ہے

بندہ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے

خضر کا پیغام کیا، ہے پیام کائنات

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر

شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

دست دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی

اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات (بانگ درا)

کلام اقبال کا تجزیہ کیا جائے تو بالعموم دو صورتیں نظر آتی ہیں۔ پہلی صورت میں ایک عالمی واقعہ کے طور پر اشتراکی انقلاب روس کا تذکرہ ہے اور یہ مشرق کے پسماندہ اور محکوم ممالک کا قدرتی رد عمل ہے۔ جو حیرت و مسرت کے ملے جلے جذبات کا حامل ہے، دوسری صورت میں اشتراکی نظام کے مقابلے میں اسلام کے نظام عدل و انصاف، معاشی انصاف اور اخوت و مساوات کو پیش کر کے اول الذکر پر اس کی برتری ثابت کی ہے۔ سوشلزم یا اشتراکیت کے بارے میں اقبال کے خیالات کا جائزہ لیتے ہوئے غلام حسین ذوالفقار لکھتے ہیں: "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ میں جہاں مغرب کے اکثر نظام ہائے فکر کا تجزیہ ملتا ہے، وہاں حوالے کے طور پر بھی کہیں سوشلزم یا کمیونزم کا ذکر نہیں ملتا"[15] اس سے ہم بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اقبال کو اس نظام سے کتنی دل چسپی تھی۔

ایک خاص ترقی پسند حلقہ کی طرف سے مسلک کو بنیاد بنا کر اقبال کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا اور رجعت پسند کہا گیا بعد میں اسی حلقہ کے احباب بدلے ہوئے حالات کے تناظر میں متفرق اشعار کے فکری سیاق و سباق کے حوالے سے انہیں اب ترقی پسند تسلیم کرتے ہیں۔ حالانکہ اقبال نہ پہلے رجعت پسند تھے نہ اب ترقی پسند ہو گئے ہیں۔ ترقی پسند اور کون ہو سکتا ہے؟ چند مماثلتوں کی بنا پر اقبال کی خضر راہ یا پیام مشرق میں مارکس اور لینن کی تعریف کی ہے تو اس سے مطلب یہ ہر گز نہیں ہے کہ اقبال ان کے حلقہ کے اثر میں آ گئے ہیں۔ابلیس کی مجلس شوریٰ میں اقبال نے اشتراکی فکر سے واضح انداز میں پردہ اٹھایا ہے اور اسلام کو حیات جاوداں کہا ہے۔ جس میں انسان کے تمام تر مسائل کا حل موجود ہے۔

تیسرا مشیر: وہ کلیم بے تجلی وہ مسیح بے صلیب

نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب

ابلیس: دست فطرت نے کیا ہے جن گریبانوں کو چاک

مزدکی منطق سوزن سے نہیں ہوتے رفو

کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد

یہ پریشاں روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ مو

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے

جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرار آرزو (ارمغان حجاز)

اقبال کے نزدیک روسی اشتراکیت یورپ کے سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف ردعمل کی ایک تحریک تھی لیکن ان کے نزدیک مغرب کی سرمایہ کاری اور روسی اشتراکیت دونوں افراط و تفریط کا نتیجہ تھیں، اعتدال کی راہ وہی ہے، جو قرآن نے بتائی ہے۔ شریعت کا مقصود یہ ہے کہ سرمایہ داری کی بنا پر ایک جماعت دوسری پر غلبہ حاصل نہ کر سکے اور اس مقصد کے حصول کے لیے وہی راہ آسان اور قابل تقلید ہے جس کے بارے میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان فرمایا ہے۔ "اسلام سرمایہ کی قوت کو معاشی نظام سے خارج نہیں کرتا بلکہ فطرت انسانی کا لحاظ کرتے ہوئے اسے قائم رکھتا ہے اور ایک ایسا معاشی نظام تجویز کرتا ہے جس پر عمل پیرا ہونے سے یہ قوت کبھی اپنی مناسب حدود سے تجاوز نہیں کر سکتی۔[16]

اردو کے بعض ناقدین نے اقبال کو اشتراکی ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ اقبال اشتراکیت کے بانی کارل مارکس (1818-1883) کے ہم خیال اور مبلغ ہیں۔ اس طرح کے اعتراضات نہ صرف اقبال کی زندگی میں بلکہ ان کی وفات کے بعد بھی کیے جاتے رہے، مثال کے طور پر اقبال کی زندگی میں روزنامہ "زمیندار" کی اشاعت 23 – جون، 1923 میں شمس الدین کا ایک مضمون شائع ہوا۔ جس میں خضر راہ اور پیام مشرق کی چند ایک نظموں کے حوالے دے کر نا صرف اقبال کو اشتراکی کہا گیا بلکہ مبلغ اعلیٰ قرار دیا گیا۔ ڈاکٹر سید اختر جعفری رقمطراز ہیں: اس مضمون کی اشاعت کے اگلے روز "زمیندار" کے اخبار میں اقبال کا ایک مراسلہ شائع ہوا جس میں مذکورہ مضمون کی تردید کی گئی اور صراحت کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا گیا۔

> " میں نے اپنے ایک دوست سے سنا ہے کہ آپ کے موقر اخبار میں کسی صاحب نے مجھے کمیونسٹ ثابت کرنے کی سعی کی ہے۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے مجھے علم ہے کہ کمیونسٹ ہونا اسلام سے منحرف ہونے کے مترادف ہے۔ مجھے افسوس ہے اور میرا فرض بنتا ہے کہ میں اس امر کی تردید کروں۔ خدا کے فضل و کرم سے میں مسلمان ہوں اور مجھے یقین ہے کہ انسان کی جملہ معاشی برائیوں کا حل قرآن مجید میں موجود ہے۔ میرا یہ یقین پختہ بنیاد پر ہے اور اس میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ جب بھی سرمایہ دارانہ نظام اپنی حدود سے سے تجاوز کر جاتا ہے۔ اس وقت سے وہ دنیا کے لیے لعنت اور مصیبت بن جاتا ہے لیکن انسانیت کو اس کے پنجہ استبداد سے آزاد کرانے کا یہ علاج نہیں کہ اسے صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے جیسا کہ بالشویک نے تجویز کیا ہے۔ قرآن مجید نے وراثتی قانون پیش کیا ہے اور زکوۃ کا طریقہ بتایا ہے جو فرض ہے وراثت اور زکوۃ سے اس کا زور نا صرف کم ہو جاتا ہے بلکہ محدود ہو جاتا ہے۔ "[17]

مارکس اپنے منشور اشتراکیت (*Communist Menufesto*) کے آغاز میں لکھتا ہے۔ " سرمایہ داروں نے جو ظلم و تشدد برپا کر رکھا ہے اس کا واحد علاج یہ ہے کہ دنیا سے جماعتی تفریق مٹا دی جائے۔ عمرانی زندگی کے مصائب و آلام صرف جماعتی امتیازات کی بنا پر ہیں اور اس کا ازالہ مزدوروں کی جماعت کا برسر اقتدار آ کر، عالم گیر یکسانیت و مساوات پیدا کرتا ہے۔ "[18]

ماسکو یونیورسٹی کے پروفیسر (F. Hecker Julius) اپنی کتاب موسومہ (*Religion Under Soviet*) میں لکھتے ہیں: " ان کے نزدیک زندگی صرف اسی دنیا کی ہے اس کے بعد پھر وہ کسی اخروی زندگی کے قائل نہیں ہیں۔ ان خیالات کی نشر و اشاعت کے لیے ان کی سوسائٹیاں قائم ہیں جنہیں جمعیت منکرین خدا (Union of the Godless) کہا جاتا ہے۔ ان جماعتوں کو اشتراکی پارٹی کی پوری حمایت حاصل ہے۔ "[19]

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.1 2024

1936 میں اس انجمن (منکرین خدا) کا صدر (Yaroslavsky) کی تقریر کے اقتباسات اخبارات میں شائع ہوئے جن میں اس نے اپنی انجمن کے اراکین کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ : "چونکہ خدا کے خلاف پروپیگنڈہ کچھ سست پڑ گیا ہے۔ اس لیے خطرہ ہے کہ مذہب کا شگوفہ پھر نہ پھوٹ نکلے۔ لہذا ضرورت ہے کہ پروپیگنڈہ زیادہ شدومد سے کی جائے۔" [20]

سوشلزم کی تحریک خالصتاً ایک لادین افکار کی حامل تحریک ہے۔ جس سے اقبال کی مناسبت قائم کرنا سراسر ناانصافی ہے۔ اقبال کے افکار کلی طور پر قرآن مجید کی تقلید ہے۔ اقبال کے فکری ارتقاء اور مثنوی کے تناظر کو ملحوظ خاطر رکھے بغیر کلام شاعر سے اپنے اپنے مطالب نکالنا، ناانصافی ہے۔ مختلف لوگوں کو فکر اقبال میں تناقض و تضاد نظر آتا ہے۔ انہیں ترانہ ہندی والے اقبال مختلف نظر آتے ہیں۔ اقبال اپنے زمانے کی بعض تحریکوں مثلاً اشتراکیت اور بعض شخصیات جیسے " مسولینی کا ذکر کسی جگہ اگر اچھے الفاظ میں کرتے ہیں تو کچھ حضرات انہیں اشتراکیت کا موید سمجھ لیتے ہیں تو کچھ انہیں فاشسٹ کا حامی قرار دیتے ہیں"۔[21] حتیٰ کہ ہمارے ملک کا ایک فلسفی رواداری میں یہ تک کہ گیا کہ اقبال نے فارسی نظموں میں عقل و خرد کی بہت تحقیر کی ہے غلام حسین ذوالفقار اپنی کتاب میں لکھتے ہیں۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال عقل کے پیچھے لٹھ لیے پھرتا ہے کہ جب بھی موقع ملے ایک ضرب رسید کر دے۔"[22]

دراصل ہمارے ہاں ادب میں مقصدیت کے ضمن میں ایک بنیادی غلطی شروع سے ہے جو کسی کو معلوم نہیں ہوتی۔ ادب میں مقصدیت کو صرف ترقی پسند ادب کی تحریک کے منشور تک محدود کرتے ہوئے اسے اشتراکیت سے مشروط کر دیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس سے قبل بھی مخصوص عصری تقاضوں کی مناسبت سے ادب میں مقصدیت کے دو اور زاویے ملتے ہیں۔ پہلا سر سید احمد خاں کی علی گڑھ تحریک اور دوسرا اقبال کے افکار و تصورات سے معرض وجود میں آیا۔ البتہ یہ درست ہے کہ سر سید کی مقصدیت اصلاحی تھی اور اقبال کی اسلامی، دونوں کی اساس اخلاقی اقدار پر استوار تھی اور معاشرتی بہبود مقصد خاص پر۔

ادب اور زندگی میں مصنف نے اقبال کے عنوان کے تحت فکر اقبال کو اپنے علم کی کسوٹی پر پرکھتے ہوئے اس کا تنقیدی جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ مصنف کے خیال میں "اقبال فاشیست کا ترجمان، وطنیت کا مخالف، قومیت کا علمبردار، جمہوریت کا دشمن اور ڈکٹیٹر شپ کا حامی ہے۔"[23] اختر حسین رائے پوری (1912-1992) نے اپنے تنقیدی مضامین کے ذریعے انقلابی ادب کے تصور کو اردو ادب میں واضح طور پر پیش کیا۔ ان کی تحریروں سے ترقی پسند تحریک اور اس کی نشوونما کے لیے زمین تیار ہوئی۔ انہوں نے اپنے وقت کے تاریخی تقاضوں کے پیش نظر ادب میں ایک نئی فکری جہت کی نشاندہی کی۔ اردو میں اشتراکی تنقید کا آغاز بھی انہی کے ذریعے ہوا۔ آپ نے فرسودہ روایات کے خلاف آواز بلند کی۔ جب آپ کا مضمون "ادب اور زندگی" شائع ہوا تو اسے ترقی پسند تحریک کے نکتہ نظر کے مطابق بنیادی مضمون شمار کیا گیا اور اسے اپنے زمانے کی "بوطیقا" کا درجہ حاصل ہوا۔ ان کی کتاب "*ادب اور انقلاب*" سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ ادب کو اشتراکی تصورات کی تبلیغ کا ذریعہ گردانتے ہیں۔ انہوں نے اس کا اظہار کھلم کھلا تو نہیں کیا لیکن ان کی تحریروں میں اشارے ملتے ہیں، لکھتے ہیں۔ ادب کا اولین فرض ہے "دنیا سے قوم، وطن، رنگ، نسل، طبقہ و مذہب کی تفریق کو مٹانے کی تلقین کرے۔ اس جماعت کی ترجمانی ہو جو اس نصب العین کو پیش نظر رکھ کر عملی اقدامات کرے۔"[24]

اختر حسین رائے پوری "گرد راہ" میں علامہ اقبال سے اپنی آخری ملاقات کا احوال بیان کرتے ہیں۔ یہ ملاقات پانی پت میں مولانا الطاف حسین حالی کی صد سالہ سالگرہ کے 1936 کے جلسے میں ہوئی۔ جب کہ ان کا مقالہ "ادب اور زندگی" اقبال کی نظر سے گزر چکا تھا۔ جب کسی نے اقبال سے میرا تعارف ان الفاظ میں کیا کہ یہ آپ کی شان میں گستاخانہ باتیں لکھ گئے ہیں تو انہوں نے کمال شفقت سے فرمایا۔ "ایسے مخلص نوجوان کی میں قدر کرتا ہوں۔ بے جان لوگوں کے اتفاق پر جان دار لوگوں کے اختلاف کو ترجیح دیتا ہوں۔" [25] اختر حسین رائے پوری لکھتے ہیں : "اس وقت میں نے اقبال کا کلام جستہ جستہ پڑھا تھا۔ اب انصاف کا تقاضہ ہے کہ ان کی شاعری اور عظمت کا اقرار کروں۔ غم دوراں کا ایسا قصیدہ خواں بیسویں صدی میں کوئی شاعر پیدا نہ ہوا۔"26

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.1 2024

احمد ندیم قاسمی کا ایک مضمون "اقبال کے ساتھ انصاف کیجئے" اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے اولاً تو اقبال کے کلام کو پوری طرح منظرِ عام پر نہ آنے دیا گیا اور یہ کام سرانجام دینے میں برسوں کا عمل ہے۔اس کے منصوبہ کاروں میں ارباب حکومت وسیاست کے علاوہ بعض ارباب علم وادب بعض ارباب تعلیم بھی شامل تھے۔ پاکستان کے پہلے عام انتخابات کے دنوں میں ٹی وی کی طرف سے اقبال کا ایک شعر ناظرین کو بار بار سنایا جاتا رہا۔

تیری خاک میں ہے اگر شرر، تو خیال وفکر تمنا نا کر

کہ جہاں میں نان شعیر پر ہے، مدار قوت حیدری

کلام کی عمدگی میں کوئی کمی نہیں لیکن جس نیت سے یہ شعر بار بار سنایا گیا وہ کسی صورت نیک نہ تھی۔اقبال کے اشعار کو اپنے مقصد خاص کے لیے پیش کیا جاتا رہا۔ورنہ وہ کون ہے جس میں ذرا بھر بھی شعور ہو اور ضرب کلیم کا مطالعہ کرتے ہوئے اقبال کا یہ شعر نظرانداز کر دے۔

دہکاں ہے کسی قبر کا اگلا ہوا مردہ

پوشیدہ کفن جس کا ابھی زیر زمیں ہے

اس شعر میں مروجہ ظالم سرمایہ دارانہ نظام اور جبر واستحصال کے خلاف واضح اظہار ہے۔ لیکن یہ کسی معمولی شاعر کی بات نہیں۔اس شعر کے لفظ میں اور اس کے مفہوم میں اقبال کی شخصیت بول رہی ہے جب کہ اسے لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رکھا گیا ہے۔میری ان معروضات کا ایک ثبوت یہ ہے "جہاں تک میری یادداشت ہے یہ شعر ریڈیو سے نشر نہیں ہوا اور ٹی کی سکرین اس شعر سے مستقل طور پر محروم رہی۔میں سوچتا ہوں کہ اس شعر میں ایسی کون سی ناگفتہ بہ بات کہی گئی ہے جو ان اداروں اور گروہوں کی طبع نازک پر گراں گزرتی ہے۔جس لیے انہوں نے اقبال کے اس لاجواب شعر کو اقبال کے کلام سے عملاً خارج کر رکھا ہے" [27] مذکورہ مضمون میں احمد ندیم قاسمی رقمطراز ہیں:

> "جن افراد یا اداروں کو علامہ اقبال کے ارشادات سے یہ توقع ہے کہ ان میں کہیں نہ کہیں انہیں استحصالی نظام معیشت کے حق میں کوئی دلیل مل جائے گی، وہ خود فریبی میں مبتلا ہیں۔اقبال کے اشعار کو سیاق وسباق سے الگ کر کے دیکھنے کا عمل صرف وقتی طور پر ڈھارس بندھائے گا۔اس ضمن میں علامہ اقبال کے نظریات واضح اور غیر مبہم ہیں اور ان کا یہی کمال ہے کہ ان کا کلام اپنی تاویل نہیں کرنے دیتا۔" [28]

ترقی پسند تحریک کا آغاز بیسویں صدی میں ہوا مگر احمد ندیم قاسمی کا ترقی پسند تحریک سے تعلق پاکستان بننے کے بعد ہوا۔جب کہ ذہنی طور پر وہ اس تحریک سے شروع سے ہی وابستہ تھے۔ قاسمی کا دل بھی دکھی انسانیت کے درد سے لبریز تھا۔وہ معاشرے کے طبقاتی فرق سے نالاں تھے۔اس نظام کی سفاکی کو محسوس کرتے تھے۔اس دور میں ترقی پسند ادب ہندوستان میں انقلاب لانے کی سوچ رکھتا تھا۔آپ انجمن کے واحد ادیب تھے جو پہلے دن سے ہی ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے۔احمد ندیم قاسمی راسخ العقیدہ تھے۔ترقی پسند تحریک پر حکومت کی طرف سے جب پابندی عائد کی گئی تب احمد ندیم قاسمی انجمن کے جنرل سکریٹری تھے۔آپ ابتداء ہی سے علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خان، اختر شیرانی کے افکار وخیالات سے متاثر تھے۔ترقی پسند تحریک سرسید، اقبال اور حالی کی اصلاحی تحریک کی ہی ایک نئی اور ترقی یافتہ شکل تھی۔اقبال کی طرح احمد ندیم قاسمی کو بھی اعتراضات کا سامنا کرنا پڑا۔یہ اعتراضات اقبال اور قاسمی دونوں میں مشترک ہیں۔ترقی پسند تحریک میں ایک حلقہ وہ بھی تھا جو اشتراکیت سے متاثر ہو کر خدا اور دیگر مذہبی عقائد سے منکر ہو گئے تھے۔سجاد ظہیر اور دوسرے ترقی پسندوں کو آپ سے کچھ شکایات تھیں۔سجاد ظہیر نے ایک خط کے ذریعے احمد ندیم قاسمی کو پیغام بھیجا کہ آپ کمیونسٹ پارٹی کے ممبر ہو جائیں۔آپ نے اس خط کا جواب کچھ یوں دیا۔"خدا کی واحدانیت اور رسول اللہ پر ایمان رکھتے ہوئے کمیونسٹ کیسے ہو سکتا ہوں، میں انجمن کے منشور کا پابند ہوں نا کہ کمیونسٹ مینی فیسٹو کا۔" [29]

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.1 2024

اقبال اور ادباء کے ایک حلقہ کے درمیان بھی یہی زاویہ معترضہ ہے۔ بیسویں صدی میں شروع ہونے والی ترقی پسند تحریک خالصتاً انقلاب روس سے متاثر مارکسیت کی پروردہ تھی۔ جب کہ اقبال کے نزدیک اسلام دنیا کا سب سے "ترقی پسند" دین ہے۔ ملائیت کے مذہب سے الگ سادہ سچا اور انسان دوست دین ہے۔ سوشلزم ایسا تصور ہے جسے غریبوں نے امیر طبقے کے خلاف حسد اور انتقامی جذبے سے شروع کیا۔ اس کے مدمقابل اگر اسلامی نظریہ حیات کی بات کی جائے تو وہ معاشرے میں غریب اور کمزور طبقے کی فلاح کی بات کرتے ہے۔ اقبال کے نزدیک سوشل ازم خدا کے بغیر ریاستی تصور کا نام ہے اور ایسا نظام کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتا جس میں روحانیت نہ ہو۔

جدا ہو دیں سیاست سے تورہ جاتی ہے چنگیزی

بالشویک سوشلزم کے برعکس اسلام نے کمزور اور غریب طبقات کی جس طرح بات کی ہے اشتراکیت کی اگر بات کی جائے تو ہجرت مدینہ سے بڑھ کر اشتراکیت کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ انور معظم اپنے مضمون "عقلیت پسند جمال الدین افغانی: اسلامی سوشل ازم کی حمایت" میں لکھتے ہیں۔ "معقول اور مفید سوشل ازم صرف اسی قسم کا اسلامی سوشلزم ہے۔ جس پر خلفاء، حضرت ابو بکر اور حضرت عمر نے عمل کیا۔ اس کے علاوہ کسی اور طرح کا سوشل ازم محض ایک نعرہ ہو گا اور اس کا انجام خون خرابے اور معصوموں کا قتل عام اور بربادی ہو گا۔" 30

علامہ اقبال نے روس کی اس جدید انقلابی تحریک کا بنظر غائر مطالعہ کیا اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ کمیونزم یا سوشل ازم کا معاشی نظام تو قریب قریب وہی ہے، جو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بیان کیا ہے۔ لیکن اس کا فلسفہ حیات، اسلام کی یکسر نقیض ہے اور کسی مسلمان کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتا نیز انہوں نے علیٰ وجہ البصیرت اس حقیقت کو بھی محسوس کیا کہ اس قسم کا معاشی نظام صرف اس فلسفہ حیات کی بنیادوں پر قائم ہو سکتا ہے جو قرآن پیش کرتا ہے۔ کمیونزم کا فلسفہ حیات اس بار گراں کا متحمل نہیں ہو سکتا اس لیے مارکسی کمیونزم دنیا میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس نظام کو اگر قرآن کی تعلیمات پر استوار کیا جائے تو پھر یہ کامیاب ہو سکتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے 1931 میں سر فرانسس ینگ ہسبنڈ کے نام ایک خط میں اپنا مشہور فارمولا بتایا تھا، اس سے یہی مفہوم نکلتا تھا۔ وہ فارمولا یہ تھا:

بالشوزم+خدا=اسلام 31

اس سے ان کا مقصد یہی تھا کہ سوشلزم کے معاشی نظام کو اسلام کے فلسفہ حیات کی بنیادوں پر استوار کیا جائے تو وہ اسلام کے معاشی نظام کے مماثل ہو جائے گا اور جب اقبال نے اپنی مشہور نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں ابلیس کی زبانی یہ کہلوایا تھا کہ:

مزدکیت فتنہ فردا نہیں اسلام ہے!

یہاں ایک وضاحت ضروری ہے کہ یورپ میں ان اشتراکی جماعتوں کا نام، جو پہلے اور دوسرے کمیونسٹ انٹرنیشنل کی رکن تھیں، سوشل ڈیموکریٹک لیبر پارٹی ہوتا تھا۔ اس لیے اقبال نے اشتراکیت اور سوشل ڈیموکریسی کے الفاظ ایک ہی مطلب کے لیے استعمال کیے ہیں۔ ایک اور خط میں اقبال نے سر فرانسس ینگ ہسبنڈ کو لکھا ہے (1930): "اگر بالشوزم میں خدا کی ہستی کا اقرار شامل کر دیا جائے تو بالشوزم اسلام کے بہت ہی قریب آ جاتا تھا۔ اس لیے متعجب نہ ہوں گا کہ اگر کسی زمانے میں اسلام روس پر چھا جائے یا روس اسلام پر۔" 32 جون 1937 قائد اعظم کے نام ایک خط میں اقبال لکھتے ہیں۔ "اسلام کے لیے اشتراکی جمہوریت کو کسی موزوں شکل میں قبول کرنا حقیقت میں اسلام سے انحراف نہیں بلکہ اسلام کی اصل پاکیزگی کی طرف لوٹنے کے مترادف ہے۔ 33

محاکمہ

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.1 2024

فکراقبال کے اساسی عناصر اربعہ خودی، وجدان اور عمل کے سلسلے میں یہ بنیادی نکتہ ملحوظ رہے کہ انہوں نے یہ اور ان سے وابستہ ذیلی تصورات غلامی ہند کے مسلمانوں کے لیے مدون کیے تھے۔ اگر آج وہ زندہ ہوتے تو ان حالات کے تناظر میں یقیناً کچھ اور ہی شاعری کی ہوتی۔ لیکن اس کے باوجود اس حقیقت سے صرف نظر بھی ممکن نہیں کہ عہد غلامی کی شاعری آزاد مملکت کے باشندوں کے لیے اب بھی چراغ ہدایت ثابت ہو رہی ہے تو یہ فکر اقبال کا اعجاز ہے اور فکر ملت کی عین نگاہوں کی کرشمہ سازی بھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ اقبال اب محض پاکستان یا عالم اسلام کے شاعر کی حیثیت سے بلند ہو کر ممدوح عالم قرار پا چکے ہیں۔ حکومت پاکستان کے سفارت خانوں کی اقبال شناسی اور سفیروں کی اقبال فہمی کی وجہ نہیں بلکہ اس لیے کہ اقبال کا فلسفہ ایسے تصورات پر مبنی ہے جو بیک وقت مختلف النوع سیاسی نظام والے ممالک اور اس کے برعکس اقتدار کے حامل معاشروں میں فکر انگیز ثابت ہو سکتا ہے۔ باالفاظ دیگر اقبال دنیا کے چند مفکرین میں شمار کیے جانے کے لائق ہیں۔ جن کے افکار آفاقی صداقت کے امین ہونے کے دعویدار ہیں۔

حوالہ جات

1۔الطاف حسین حالی،*مقدمہ شعر و شاعری* (ہارون آباد: لاثانی کتب خانہ، سن ندارد) 55.

2۔Ali Sardar Jafri , *Progressive Movement and Urdu Poetry,* Urdu Canada, Feb 1966, vol, I, 9.

3۔پروفیسر صاحب علی و شبانہ محمود، *ترقی پسند تحریک اور بمبئی انگارے: ایک جائزہ* (کراچی: بزم تخلیق ادب، 2018) 11۔

4۔(تبصرہ) نوید ظفر، *شاہد احمد دہلوی، حالات و آثار* ، سہ ماہی الاقربا (اسلام آباد: الاقربا فاؤنڈیشن، 2009) 301 ۔

5۔ایضاً، 301۔

6۔ایضاً، 301۔

7۔سید سجاد ظہیر، *علامہ اقبال سے پہلی و آخری ملاقات، علامہ اقبال کی رخشندہ یادیں*، مرتبہ، ندیم شفیق ملک (اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، 2018) 224۔

8۔ایضاً، 227۔

90۔ایضاً، 227 ۔

10۔ سلیم اختر، *اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ* (لاہور: سنگ میل 2013) 434 ۔

11 علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب، جلد اول (علی گڑھ: انجمن ترقی اردو ہند، 1951) 193۔

12۔شریف کنجاہی، *علم الاقتصاد دا پنجابی ترجمہ* (لاہور: بزم اقبال، 1978) 4 ۔

13۔علامہ محمد اقبال، *علم الاقتصاد* (کراچی: اقبال اکادمی پاکستان، 1961) 23 ۔

14۔ڈاکٹر سلیم اختر، *اقبال کی فکری میراث* (لاہور: بزم اقبال 1996) 106۔

15۔غلام حسین ذوالفقار،اقبال ایک مطالعہ(لاہور: بزم اقبال،1997) 126 ۔

16۔معین الدین عقیل،دنیائے اسلام میں اشتراکیت کامسلہ اوراقبال،اقبال ممدوح عالم(مرتبہ)،ڈاکٹر سلیم اختر(لاہور: بزم اقبال،1978) 526۔

17۔سید اختر جعفری،علامہ اقبال پراشتراکی ہونے کاالزام کیوں؟؟،اقبال ممدوح عالم(مرتبہ)،ڈاکٹر سلیم اختر،537 ۔

18۔اشتراکیت اوراسلام کامسئلہ،معاشی مسائل کاحل،روس اورحجاز کے نظریوں کے مطابق،سلسلہ مطبوعات نمبر10،(دہلی:ادارہ طلوع اسلام،س۔ن)16

19۔ایضاً21

20۔ایضاً21

21۔غلام حسین ذوالفقار،اقبال ایک مطالعہ، 96

22۔ایضاً۔

23۔اختر حسین رائے پوری،علامہ اقبال سے ملاقاتیں،اقبال کی رخشندہ یادیں،مرتبہ ندیم شفیق ملک(اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن2018) 32۔

24۔اشتراکیت اوراسلام کامسلہ،معاشی مسائل کاحل روس اورحجاز کے نظریوں کے مطابق،سلسلہ مطبوعات نمبر(10) 16۔

25۔اختر حسین رائے پوری،گردراہ (کراچی: مکتبہ افکار،س۔ن) 85۔

26۔ایضاً،85

27۔احمد ندیم قاسمی،اقبال کے ساتھ انصاف کیجیے،مشمولہ بزم اقبال،شمارہ:4 (لاہور: بزم اقبال1974) 24۔

28۔ایضاً،28۔

29۔ماریہ بلال،ڈاکٹر عامر اقبال،احمد ندیم قاسمی کی ادبی زندگی پر ترقی پسند تحریک کے اثرات: تحقیقی جائزہ،مشمولہ خیابان خزاں (اسلام آباد: 2022) 07۔

30۔انور معظم،عقلیت پسند جمال الدین افغانی: اسلامی سوشلزم کی حمایت،مشمولہ تحصیل شمارہ:09،(کراچی: ادارہ معارف اسلامی،2021) 33۔

31۔ماہنامہ نصرت لاہور،خاص نمبر اسلامی سوشلزم(لاہور: ادارہ البیان،1966) 73۔

32۔ایضاً 90۔

33۔ایضاً 02۔